



جاری تھی۔ میں حیران بھی ہوا کہ کپاس تو تھوڑی ہی تھی۔ دھننے جانے کے ساتھ روئی کا کتنا انبار لگ گیا ہے۔ اصل میں ابھی تک وہی عمل چل رہا تھا کہ میری اپنی یادوں میں دنیا جہاں کی یادیں آتی تھیں۔ اس وقت تو خیر میں نڈھال تھا۔ اتنی سکت ہی نہیں تھی کہ پرانی یادوں کو اپنی یادوں میں رلنے ملنے سے روک سکوں۔ اب اتنا بے سکت تو نہیں تھا۔ حالت کافی بہتر تھی۔ کہاں رقیق چیزوں پر گزارہ تھا۔ کہاں اب شور بے کے ساتھ پھلکا کھا رہا تھا۔

”صاب‘ آپ نے بہت کم کھایا“ نعمت خاں میری خوراک سے مطمئن نظر نہیں آتا تھا۔
 ”نعمت خاں اور کتنا کھاؤں اتنا تو کھالیا۔ کئی دن کے بعد آج سیر ہو کر کھایا ہے۔“
 ”اصل میں جی‘ آپ کی بھوک کم ہو گئی ہے۔ خوراک پوری کھائیں گے۔ پھر جان آئے گی۔“
 ”اچھا پانی پلاؤ۔“

نعمت خان نے جلدی سے پانی کا گلاس میری طرف بڑھایا۔ میں نے پانی پیا اور فوراً ہی بیٹھے سے لیٹ گیا۔ بستر پہ بیٹھے بیٹھے ہی تو کھانا کھایا تھا۔ فوراً ہی آنکھیں مند نے لگیں۔ خیال تھا کہ نیند آ رہی ہے۔ سو جاؤں گا۔ مگر اندر کی دھنک دھنک نے سونے نہیں دیا۔ روئی کا انبار لگتا چلا جا رہا تھا۔ مگر ہاں میں کیا کہہ رہا تھا کہ اس وقت تو اتنی نقاہت تھی کہ دنیا جہاں کی یادوں باتوں کو اپنی یادوں میں رلتے ملتے دیکھ رہا تھا اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اب اتنا بے دم نہیں تھا۔ مگر پھر بھی وہ عمل جاری تھا۔ شاید اب مجھے اس کا پتہ ہی نہیں چل رہا تھا۔ کہاں کہاں کی واردات‘ کہاں کی بات۔

”میرے لال‘ کتنی دفعہ سنو گے وہ کہانی۔“

”پھوپھی اماں‘ ایک دفعہ اور۔“

”اچھا تو سنو۔ ایک تھی مینا۔ اس کا پڑوسی تھا ایک کوا۔ مینا تو گھر والی تھی۔ یہ بخت مارا گھر تھا۔ مینا روز شام پڑے اپنے گھونسلے میں گھس جاتی اور رات آرام سے گزارتی۔ کوا بیچارہ تھکا ہارا آتا اور مینا کے گھونسلے کے برابر والی ٹہنی پہ بیٹھ کے اوگھنے لگتا۔ ایک دن مینا نے طعنہ دیا کہ اے بھیا کوئے‘ تم کب تک بے گھر بے درر ہو گے۔ کوئے کو مینا کی بات کھا گئی۔ سوچا کہ مجھے بھی گھر بنانا چاہئے۔ اور ایسا گھر ہو کہ مینا بھی اسے دیکھ کے عیش عیش کرے تو بھیا اس کوئے نے ایک بننے کی دکان میں کوئل لگایا۔ بار بار اندر جاتا اور نمک کی ایک ڈلی چونچ میں دبا کے لے آتا۔ اس طرح اس نے بہت سا نمک جمع کر لیا۔ اس نمک سے اس نے اپنا گھر بنایا۔“

”پھوپھی اماں‘ نمک کا گھر۔“ من کتنا حیران ہو رہا تھا۔



”ہاں بیٹا، نمک کا گھر۔ گرمی کی دو پہروں میں ایسا چمکے تھا جیسے نمک کا نہ ہو، شیشے کا گھر ہو۔ مگر اس کے بعد آگنی برسات اور لگ گیا جھکا۔ اے لو وہ مکان تو مینہ میں گھل گھلا کے ختم ہو گیا۔ مینا نے طعنہ دیا کہ اے بھیا تم نے گھر بنایا بھی تو نمک کا۔ تمہیں پتہ نہیں تھا کہ موسم سدا ایک سا نہیں رہتا۔ گرمی کے بعد برسات تو آنی ہی تھی۔ نمک ہی تو تھا، گھل گیا۔ مینا کی بات کوے کو تیر بن کے لگی۔ اس نے سوچا کہ اب کے ایسے سامان سے گھر بناؤں جس پہ برسات اثر نہ کرے۔ بس یہی سوچ کے اس نے بہت سا راموم جمع کیا اور گھر بنانا شروع کر دیا۔ اس کا موسم محل برسات میں دھل کے ایسا لگے تھا جیسے سنگ مرمر کا بنا ہوا ہو۔ برسات کے بعد جاڑے آئے کوے نے پورا موسم آرام سے گزارا۔ مگر بھیا اس کے بعد آگنی گرمی۔ اے بھیا دھوپ جو چمکی تو سا راموم پگھل گیا۔ کوے کا گھر پھر ڈھس گیا بلکہ بہہ گیا۔ کوہ بہت اداس ہوا۔ ٹھنڈا سانس بھر کے بولا کہ مجھ کوے کی قسمت میں گھر نہیں۔ اور پھر پہلے کی طرح ٹہنی پر بسیرا کرنے لگا۔“

میرا دھیان پھر ناگیشری رانی کی طرف چلا گیا۔ صبح روئی تھی۔ پچھلا جنم یاد آنا تو ایک مصیبت ہے۔ حافظہ اپنے محدود دائرے میں گردش کرتا رہے بس اسی میں عافیت ہے۔ حافظہ کی بھی اپنی ایک لکشمی رکھا ہوتی ہے۔ اس رکھا سے قدم نکالا اور مصیبت میں پھنسے۔ آگے تو جنگل ہی جنگل ہے۔ ایسا جنگل جس کا کوئی اور چھوڑ نہیں ہے اور پھر راکشس۔ تو ناگیشری رانی صحیح روئی بلکہ اسے تو زیادہ ہی رونا پڑ گیا۔ اس کا رن کہ راجہ کو بھی اپنا پچھلا جنم یاد آ گیا۔ بلکہ راجہ کو تو اس سے بھی پچھلا جنم یاد آ گیا۔ مصیبت در مصیبت۔ ایک جنم خوار ہونے کے لئے کیا کم ہوتا ہے۔ پھر دوسرا جنم کیوں۔ اور خالی دوسرا جنم جنموں کا تو کوئی انت ہی نہیں۔ جنم جنم کی خواری۔ ناگیشری رانی سمجھ رہی تھی کہ جب وہ اور راجہ ہنس ہنسی تھے اور مانس ورجیل کے کنارے رہتے تھے۔ تب بہت سکھی تھے۔ مگر وہ سکھ کتنے دن کا تھا۔ پھر آندھی چل پڑی۔ اس آندھی میں وہ پھر ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ ناگیشری رانی کو یہ بات ذرا بعد میں یاد آئی۔ وہ پھر دکھی ہو گئی۔ میمونہ کو دیکھو۔ اسے یہ یاد ہی نہیں آ رہا تھا کہ پھوپھی اماں نے یہ کہانی کب سنائی تھی۔ جب اسے یاد آیا تو بالکل گرم سم ہو گئی۔ پھر اسے یہ یاد نہیں آ رہا تھا کہ وہ آندھی میں بچھڑ کر پھر مل گئے تھے۔ کب ملے تھے؟ نہیں ملے تھے۔

”ملے تھے۔“ میں نے اصرار کیا اور کہانی کے بعد کے حصے کی کئی ایک تفصیلات اسے یاد دلایں۔ مشکل سے اسے یاد آئیں۔ ”اچھا تو پھر مل گئے ہوں گے۔“ ایسے کہا جیسے اسے ان کے ملنے کا اعتبار نہ آیا ہو۔ اور پھر ایسی چپ ہوئی کہ دیر تک بولی ہی نہیں اور سخت اداس۔

”بیچاری ہنسی کی پتہ تہیں اداس کر دیا۔“ میں نے اسے چھیڑا کہ شاید اسی طرح کچھ بولے۔

”خیر وہ تو کہانی ہے۔“ آخر وہ بولی ”اصل میں مجھے اماں یاد آ گئیں۔“

اب میں اداس ہو گیا۔ پھوپھی اماں مجھے وہاں رہتے ہوئے ویسے تو مستقل یاد آتی رہی تھیں۔ لیکن اس وقت میمونہ نے ان کا ذکر اس طرح کیا کہ میں افسردہ ہو گیا۔ ان کے نہ ہونے کا اس وقت کچھ زیادہ ہی شدت سے احساس ہوا۔ یہ بڑی بھابھی کے درمیان میں کود پڑنے سے پہلے کی بات ہے بلکہ اس کے بعد تو اور شدت سے یہ احساس ہوا پھوپھی اماں ہوتیں تو پھر یہ صورت تھوڑا ہی پیدا ہوتی۔ وہ ہوتیں تو میمونہ بھلا مجھ سے اس کھڑتل انداز میں بات کرتی۔ خیر یہ بات تو درمیان میں یونہی آ گئی۔ ذکر تو یہ تھا کہ پھوپھی اماں نے مجھے کہانیاں کتنی سنائی تھیں اور ہنس ہنسی کی تو جانے کتنی کہانیاں انہیں یاد تھیں۔ ہنس ہنسی کا ملنا اور بچھڑنا، پھر ملنا پھر بچھڑ جانا، جیسے ہجرو وصال کی ازلی ابدی داستان اصل میں ہنس ہنسی کی کہانی ہے اور یہ کوئی اقلیم سے اڑ کر آتے تھے۔ اڑتے اڑتے کبھی کسی جھیل پر اتر پڑے کبھی کسی محل کی دیوار پر آن اترے اس رنگ سے کہ محل میں بیٹھی شہزادی انہیں دیکھ کر لوٹ پوٹ ہوئی جا رہی ہے۔ کبھی تال تلیوں سے بے پرواہ بستریوں اور بنوں سے بے تعلق محلوں و محلوں سے بے نیاز آسمان کی بلندیوں میں یوں اڑتے نظر آتے جیسے کسی پاک صاف جھیل میں تیر رہے ہیں اور آن کی آن میں اوجھل ہو گئے اور ہمیشہ بعد میں یہی پتہ چلتا کہ یہ تو کسی دور دیس کے راجہ رانی ہیں یا راجکار راجکاری کہ اس جنم میں آ کر ہنس ہنسی بن گئے ہیں اور یہ کہ اب ہنس ہنسی ہیں اگلے جنم انہیں پھر راجہ رانی بن جانا ہے۔ اس وقت مجھے بالکل احساس نہیں تھا کہ ہنس ہنسی کی یہ ساری کہانیاں کیوں میرے حافظہ میں امنڈ رہی ہیں۔ کیوں میں کوشش کر رہا ہوں کہ میمونہ کو بھی یہ کہانیاں یاد آ جائیں اور کیوں وہ ہر کہانی کے حوالے سے ہنس ہنسی کے ملنے بچھڑنے کے تذکرے پر چپ اور اداس ہو جاتی ہے۔ جیسے وہ بھی کسی پچھلے جنم میں مگر یہ احساس تو مجھے ستا رہا تھا کہ جیسے میرا کوئی پچھلا جنم تھا اور میں خیر بہر حال جیسی تو وہ سادھو مجھے رہ رہ کر یاد آ رہا تھا جو کہتا تھا کہ مجھے اپنا پچھلا جنم یاد ہے۔ کتنی بار خیال آیا کہ اسے ڈھونڈنا چاہئے کہاں ہے وہ جیتا یا مر گیا۔ کب مرا؟ پچھلے جنم کا حال سنانے کے بعد؟ اچھے زمانے میں پیدا ہوا تھا۔ دوار کا میں ان دنوں ہن برستا تھا۔ مگر نگر اور بستریوں کا سدا ایک طور نہیں رہتا۔ پتہ نہیں کب ہن برستے برستے قیامت ٹوٹ پڑے۔ ”زیندر“ میں نے جب ساگر کی اور دیکھا تو کیا دیکھا کہ ساگر میں سانپ ہی سانپ جیسے ساگر نہ ہوسانپ ساگر ہو۔ میں ترنت ہی وہاں سے پلٹا آگے چلا تو کیا دیکھا کہ ایک برکش تلے بلد یوجی بیراسن مارے آنکھیں موندے بیٹھے ہیں۔ پرمنہ ان کا بھٹ کے سمان کھلا ہوا اور ہے متر میں نے دیکھا کہ بلد یوجی جو سور ماؤں بلوانوں کے بیچ ساند سمان تھے گھٹ گھٹا کے تنک سے رہ گئے تھے۔ نری ہڈیاں کہ مٹھی میں آ جاویں۔ ان ہڈیوں کے بیچ منہ جیسے بانہی اور بانسی کے بھیترے سے نکلتا سانپ کہ جو گیوں کے انگ پر ملے بھیموت کے سماں سفید۔ متر میں بھوپک رہ

رفیق صاحب کی طرف جاؤں گا۔ انہیں ساتھ لے کر غازی صاحب کے جلسہ۔ میں جاؤں گا۔“

”ہاں ہاں وہ ادھر آئے تو تھے۔ مگر میرے دماغ میں کیا پھوڑا نکلتا تھا کہ غازی صاحب کا وعظ سننے جاتا۔ اتنا فالتو وقت تو مجو بھائی ہی کی پاس ہے۔ اصل میں یہی معلوم کرنا چاہتا تھا کہ ابھی گھر پہنچے ہیں یا نہیں۔ نہیں پہنچے ہیں تو میں نکلتا ہوں اور جا کر دیکھتا ہوں بھلا آج کل کے جلسوں میں شرفاء کا کیا کام۔ پتہ نہیں وہاں کیا ہوا ہے۔“

رفیق صاحب کا گھبرا یا ہوا لہجہ چغلی کھارہا تھا کہ جلسہ میں کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔ ”کیوں؟ وہاں کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔“

”ہمارے علاقہ میں جلسہ ہوا اور گڑبڑ نہ ہو۔ کچھ نہ کچھ ہوا ہی ہوگا۔ جا کر دیکھتا ہوں۔“

”رفیق صاحب۔“ میں اب فکر مند ہو چلا تھا۔ آپ نے تو فکر میں ڈال دیا۔

”نہیں یار زیادہ فکر کی بات نہیں ہے۔ یہاں یہی ہوتا رہتا ہے۔ گڑبڑ تھوڑی ہوتی ہے۔ یہاں ہماری گلی کے لوگ اپنی طرف سے

اس میں کلی پسند نے ٹانگ دیتے ہیں۔“

”مگر تشویش کی بات تو ہے۔“

”وہ تو ہر صورت میں ہے۔ بہر حال آپ زیادہ پریشان نہ ہوں۔ میں جا رہا ہوں۔ وہاں سے واپس آ کر فوراً آپ کو فون کروں

گا۔“

”بلکہ میں یہ کروں گا کہ مجو بھائی کو وہاں سے لے کر سیدھا ادھر ہی آ جاؤں گا۔“

”جلدی آئیے۔“

”جلدی ہی آؤں گا۔“

فون بند ہو گیا۔ ریسپورر رکھ کر میں نے نظر اٹھائی تو دیکھا کہ نعمت خان کھڑا ہے۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ میں نے دل

میں کہا کہ اس شخص کو کیا ہوا۔

پوچھنے لگا۔ ”کیا کہتے ہیں رفیق صاحب جی۔“

”بتا رہے تھے کہ غازی صاحب کے جلسہ میں کچھ گڑبڑ ہوئی ہے۔“ ”جو اوصاف جی؟“ ”واں پہ تو بم پھٹا ہے۔ بہت جانیں گئی

ہیں۔ اللہ رحم کرے۔“

میرے قدموں تلے سے زمین سرک گئی۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ رفیق صاحب اتنے گھبرائے ہوئے کیوں تھے۔

”تم نے کس سے سنا۔ لوگ افواہیں بھی تو اڑاتے ہیں۔“

”نہیں جی۔ یہ افواہ نہیں ہے۔ سوسائٹی میں تو تہلکہ مچا ہوا ہے۔“

”اچھا۔“ بس اس سے آگے میں کچھ نہ کہہ سکا۔ اندر سے دل بیٹھا جا رہا تھا۔

”بھلا مجو صاب جی واں پہ کیوں گئے تھے۔“

”ہونے والی بات کا پہلے سے کسی کو پتہ تو نہیں ہوتا۔“

”اللہ رحم کر دے اور مجو صاب جی خیریت سے گھر آ جائیں۔“

”فکر نہ کرو اللہ رحم ہی کرے گا۔ رفیق صاحب انہیں لینے گئے ہیں۔ انہیں لے کر ادھر ہی آئیں گے۔“

”اچھا کس وقت تک آ جائیں گے۔“

”بس جلدی ہی آئیں گے۔“

نعمت خان تھوڑی دیر پریشان کھڑا رہا جیسے اب اس کی سمجھ نہ آ رہا ہو کہ آگے کیا بات کرے اور کیا پوچھے۔ پھر خاموشی سے وہاں سے سرک گیا۔ ادھر میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ وہ جو میں اپنے خیالوں میں غرق لیٹا تھا وہ ساری کیفیت ہی اب زائل ہو چکی تھی۔ دماغ جو ذرا سے اشارے پہ بہکتا اور کہیں سے کہیں نکل جاتا۔ اس وقت اپنی ساری چوڑی بھول گیا تھا، بس جیسے سن ہو گیا ہو۔ کتنی دیر تک میں بت بنا بیٹھا رہا۔ چونکا اس وقت جب نعمت خان نے آہستگی سے کھانا سامنے لا کر رکھ دیا۔ وہی اپنا پرہیزی کھانا۔ اس نے کہا میں نے کھانا شروع کر دیا۔ کیا کھایا کیا نہیں کھایا، پتہ ہی نہیں چلا۔ پھر اسی طرح گم صم۔“

دیر بعد پھر نعمت خان نے کمرے میں جھانکا۔ اب تو بہت دیر ہو گئی۔ آئے نہیں۔ ہاں اب تک تو آ جانا چاہئے تھا، میں نے کوشش کی کہ میرے لہجے سے کسی قسم کی تشویش ظاہر نہ ہو۔

”اللہ خیر کرے۔ نعمت خان نے آہستہ سے کہا اور باہر نکل گیا مگر زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ نعمت خان پھر آہستہ سے کمرے میں داخل ہوا۔ قریب آ کر پوچھا ”کوئی فون بھی نہیں آیا۔“

”نہیں۔“ میں نے خشک لہجہ میں کہا۔

”جانے کیا بات ہے کہ اتنی دیر لگا دی۔“

میں کتنی دیر سے اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ کوئی تشویش کی بات نہیں ہے۔ مگر نعمت خان بار بار کمرے میں آتا



بس کوئی ایک فقرہ کہتا مگر ایسا کہ اپنے آپ کو اطمینان دلانے کی میری ساری کوشش پہ پانی پھر جاتا۔ اب وہ میرے پلنگ کے قریب ہی آ کر فرش پر اس طرح پسر گیا تھا کہ اس کا سر میری پٹی سے لگ رہا تھا۔ ٹھیک کہ ایسے وقت میں ایک سے دو بھلے ہوتے ہیں مگر اسی صورت میں کہ بات کریں کہ جس سے جی بھلے جہاں دھیان ہے وہاں سے دھیان ہے۔ مگر میری خاموشی کا اس پر ایسا اثر ہوا کہ اس نے بھی جیسے منہ سی لیا ہو۔ تو وہ بھی چپ میں بھی چپ۔

”صاب جی“ آخر اس نے زبان کھولی۔ ”آپ سو جائیں آپ کو تو ویسے بھی ڈاکٹر نے آرام کرنے کے لئے کہا ہے تو آپ سو جائیں میں جاگ رہا ہوں۔ ٹیلی فون آیا تو بھی سن لوں گا۔

”ٹھیک ہے۔ سو جاؤں گا۔ نیند آئے تو سہی۔“

”طبیعت پریشان ہو تو نیند مشکل ہی سے آتی ہے۔“ اس نے آہستہ سے کہا اور چپ ہو گیا۔

”آپ جی رفیق صاحب جی کے گھر ٹیلی فون کر کے تو ذرا پوچھیں پتہ تو چلے کہ وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

اس تجویز نے واقعی سوچنے پر مجبور کیا۔ کچھ دیر تذبذب میں رہا مگر پھر جلدی ہی میں نے فیصلہ کر لیا۔ سوچا کہ رفیق صاحب کی نیگم خواہ مخواہ پریشان ہو جائیں گی۔ میں نے نعمت خان کو یہ کہہ کر مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ اتنی رات گئے گھر پر فون کرنا اور گھر والوں کو بے آرام کرنا کچھ مناسب بات نہیں ہے۔“

”ہاں یہ بات تو ہے۔“ وہ بڑبڑایا اور چپ ہو گیا۔

”صاب جی۔“ کتنی دیر بعد اس نے زبان کھولی ویسے تو میں جاگ رہا ہوں مگر نیند کا کوئی پتہ نہیں ہوتا۔ یہ کمبخت تو سولی پہ بھی آ جاتی ہے۔ تو اگر میری آنکھ لگ جائے اور دروازے کی گھنٹی بجے تو جی آپ دروازہ کھولیں نہیں۔“

”یہ کیا بات ہوئی۔“ میں اصل میں اس کی بات پر کچھ چکر اساکا گیا تھا۔

”صاب جی آج کل کسی کا کوئی اعتبار نہیں لوگ تو دن کے وقت بھی کنڈی لگا کے بیٹھتے ہیں یہ تو رات کا ٹیم ہے۔ میں تو جی بھگت چکا ہوں۔“

”بھگت چکے ہو؟ کیا بھگت چکے ہو۔“ مجھے کسی قدر تجسس ہوا وہ جی میں مجھ صاب جی کو جو بتا رہا تھا۔ پر پوری بات کہاں بتائی تھی۔ آپ تو دونوں ہسپتال میں تھے۔ میں گھر میں اکیلا۔ رات کا ٹیم رات کا منجھلا پہر ہوگا۔ دروازے کی گھنٹی بجی میں نے دل میں کہا کہ نعمت خان یہ تو گڑبڑ کی بات ہے۔ اس ٹیم بھلا آدمی آئے گا۔ تو میں چپ رہا پھر گھنٹی بجی پھر میں چپ تیسری دفعہ پھر گھنٹی بجی میں تو جی



ایسے ہو گیا جیسے گھر میں ہوں ہی نہیں۔ اوپر کا سانس اوپر نیچے کا نیچے۔ پھر گھنٹی نہیں بجی جیسے کوئی سیزھیاں اتر رہا ہو۔ میں نے کہا نعمت خان تم بچ گئے۔ جو اد صاحب جی وقت کا کوئی پتا نہیں ہوتا۔ اور یہ وقت تو ویسے ہی بہت خراب ہے۔

میں خاموشی سے سنا رہا۔ جواب کوئی نہیں دیا۔ شاید اس بیان سے میں نے کوئی ایسا اثر بھی قبول نہیں کیا تھا۔ پھر بھی اب میرے کان دروازے کی طرف تھے۔ جیسے اب گھنٹی بجی۔ دروازے بے شک نہ کھولوں مگر پوچھوں گا تو سہی کہ کون ہے۔ یا یہ بھی نہیں پوچھنا چاہئے۔ یا ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ گھنٹی نہ بجائے بہت کان لگائے کہ قدموں کی آہٹ سنائی دے۔ کوئی آہٹ سنائی نہیں دی۔

”اصل میں جی مجھے اپنے باپ کی کہی ہوئی ایک بات یاد آ گئی۔“ میری خاموشی سے فائدہ اٹھا کر وہ پھر جاری ہو گیا۔ ”ہماری جی بہت چھوٹی سی بستی تھی۔ چاروں طرف جنگل ہی جنگل مجھے کام کے لئے شہر جانا پڑے۔ لوٹنے ہوئے شام پڑ جاتی تھی کبھی کبھی بالکل ہی رات ہو جائے تھی۔ ویسے تو جی میرے پاس لائٹی ہووے تھی پر پھر بھی دل دھکڑ پکڑ کرتا رہوے تھا۔ ایک بات میرے باپ نے مجھ سے کہہ رکھی تھی کہ للارات کو یا سنا ہٹی دو پہر میں اگر کوئی تجھے پکارے اور دکھائی نہ پڑے تو پلٹ کے جواب مت دیکھو۔ ایک بیری ایسا ہی ہوا۔ شہر سے لوٹ رہا تھا بیچ جنگل میں تھا کہ رات پڑ گئی۔ لائٹی پٹختا اور کھنکھارتا چلا جا رہا تھا کہ ایسا لگا کہ کوئی مجھے پکار رہا ہے۔ کان لگائے۔ نعمت خان نعمت خان میں نے جیسے کانوں میں کڑوا تیل ڈال لیا ہو۔ جواب میں ہنکارا بھی نہیں بھرا۔ بس دل ہی دل میں قل پڑھنی شروع کر دی۔ بس پھر آواز نہیں آئی۔ اس وقت تو جی قل مجھے پوری یاد تھی۔ روز جو پڑھنی پڑھتی تھی۔ اب بہت دن سے پڑھی نہیں تھی تو یاد نہیں رہی۔ آپ جی مجھے یاد کرادیں۔ رکا پھر کہنے لگا ”اس وقت تو جی ایسا تھا کہ جب بھی جنگل میں رات پڑ جاتی تو کچھ نہ کچھ ہو ہی جاوے تھا۔ بس پھر قل ہی کا دم آوے تھی۔ ایک بیری تو ایسا ہی ہوا جی کہ میں بہت ہی ڈر گیا۔ گھنی رات ہو گئی۔ میں بیچ جنگل میں۔ پیڑ ایسے لگیں جیسے بھوت کھڑے ہیں۔ چلا جا رہا تھا کہ ایک پیڑ کی ٹہنیوں میں چھپا ہوا کوئی پرندہ تھا۔ ایک دم سے پھڑ پھڑایا۔ پھڑ پھڑا ہٹ اور پھر لمبی قاعیں۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ بس فوراً ہی قل پڑھنی شروع کر دی۔ نعمت خان نے جھر جھری لی اور چپ ہو گیا۔

پرندہ خود دکھائی نہ دے بس رات کے سناٹے میں پروں کی پھڑ پھڑا ہٹ سنائی دے اور قاعیں کی لمبی آواز جس سے فضا گونج جائے۔ ڈرنے کی بات تو ہے۔ مگر ابن حبیب نے اس کی آواز کبھی نہیں سنی۔ پروں کی پھڑ پھڑا ہٹ بھی نہیں۔ بس شہروں کی سننا ہٹ جیسے کوئی بڑا پرندہ تیزی سے اڑتا ہوا برابر سے نکل گیا ہے۔ بس اسی سے ایک انجانا ڈراس کے اندر سا گیا تھا۔ کتنے دوسو سے اس کے اندر پل بڑھ رہے تھے کہ کبھی کبھی پورا شہر ہی اسے کھانے کو آتا ہے۔



”اے عبداللہ یہ تیرا شہر عجب ہے کہ مجھے جس شدت سے رجھاتا ہے اسی شدت سے ڈراتا ہے۔ مسجدوں، حماموں اور باغوں سے معمور یہ شہر کتنی آہستہ آہستہ سحر بن کر مجھ پر چھاتا چلا گیا، میرے اندر اتر گیا۔ کتنی دفعہ مجھے گمان ہوا کہ بھاری کولہوں والی وہ میری مدد لقا نہیں کہیں ہے۔ اس کے لئے میں نے اس شہر کو کتنا کھوندا ہے۔ مگر شاد آباد کو چوں میں مہکتے حماموں کے قریب سے گزرتے ہوئے شہتوتوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں چلتے ہوئے کبھی کبھی عجب سا احساس ہوتا ہے کہ جیسے میں خرابے میں بھٹکتا پھر رہا ہوں اور اے عبداللہ میں دیکھ رہا ہوں کہ اشبیلیہ جسے میں بھول چلا تھا۔ میرے خوابوں میں واپس آ گیا ہے۔“ ابن حبیب چپ ہوا تامل کیا۔ پھر افسردہ لہجہ میں بولا مگر رات میں نے عجب خواب دیکھا جیسے میں وہاں گیا ہوں اور شاداں و فرحاں پھر رہا ہوں جیسے وہی گھر ہے وہی ہمارے جد امجد والا۔ میں خوش ہوں۔ پھر چونکتا ہوں۔ پوچھ رہا ہوں کہ وہ جو کنوئیں کے برابر کھجور کھڑی تھی۔ وہ شجر سایہ دار یہاں سے کہاں غائب ہو گیا۔ مگر کوئی جواب ہی نہیں دے رہا ہے۔ میں پریشان ہوں پھر کیا دیکھتا ہوں کہ دیوار پہ بیٹھی ایک بلی مجھے گھور رہی ہے۔ میں ڈر جاتا ہوں۔ سوچ رہا ہوں کہ وہ جو ہماری بزرگ بلی تھی۔

”صاب جی ٹیلی فون بج رہا ہے“

میں نے ہڑبڑا کر خاموش رکھے ٹیلی فون پر نظر ڈالی۔ ”نہیں کوئی نہیں بج رہا ہے۔“

نعمت خان نے جمائی لی اور سوچتے ہوئے بولا ”اچھا پر مجھے ایسا ہی لگا تھا۔ بس مجھے جھوٹا آ گیا تھا اور پھر لگا کہ ٹیلی فون بج رہا ہے۔ میری آنکھ کھل گئی۔ پھر اس نے ایک جمائی لی اور نیند بھری آواز میں بولا ”اب میں جانوں پچھلا پہر ہے۔ بس صبح ہونے کو ہے۔“

اس کے کہنے سے مجھے احساس ہوا کہ واقعی یہ تو بیٹھے بیٹھے پوری رات گزر گئی اور اسی کے ساتھ مجھے ایک دم سے نیند کا ایک جھوٹا سا آیا۔ بیٹھے بیٹھے میں تھوڑا کھسکا اور لیٹ گیا۔ بس تکیے پہ سر رکھا اور فوراً ہی میری آنکھ لگ گئی اور آنکھ لگی سو گئی۔ ذرا جو پتہ چلا ہو کہ کب چڑیاں بولیں۔ کب مرنے نے بانگ دی۔ کب اذان ہوئی بس پھر ٹیلی فون کی گھنٹی ہی سے میری آنکھ کھلی۔ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ریسورٹ اٹھانے لگا تھا کہ بند ہو گیا۔ جانے کتنی دیر سے بج رہا تھا اور کتنی دیر بج کر خاموش ہو گیا۔ نعمت خان کمرے میں نہیں تھا۔ ممکن ہے اپنی کوٹھڑی میں جا کے سو گیا ہو۔ آخر کسی نہ کسی وقت اسے بھی تو نیند آتی تھی اور اس نے ٹھیک کہا کہ کمبخت نیند ایسی چیز ہے کہ سولی پر بھی آ جاتی ہے تو فون بند ہو چکا تھا اور مجھے اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا کہ ساری رات جاگ کر اسی وقت سونا تھا اور سو بھی گیا تھا تو اس طرح کیوں سویا کہ سر ہانے رکھے فون کی گھنٹی بجتی رہی اور کمبخت آنکھ نہیں کھلی۔ اسی فون کا تو ساری رات انتظار رہا تھا اور اسی کے آنے



کے ہنگام آنکھ لگ گئی۔ مگر خیر فون کی گھنٹی پھر بجی۔ میں نے لپک کر ریسیور اٹھایا ”ہیلو کون رفیق صاحب ہاں جلدی سے بتائیے..... خیریت تو ہے نا..... ہاں ہاں آئیے مگر مجو بھائی..... کیوں..... تو آپ اکیلے..... مگر کیوں مجو بھائی کیوں..... اچھا پھر میں انتظار کر رہا ہوں۔“

مجو بھائی نے واضح طور پر کچھ نہیں بتایا۔ یہی کہتے رہے کہ آ رہا ہوں، میرا انتظار کرو پھر بھی بہت کچھ واضح ہو گیا۔ مگر واضح ہونے کے باوجود میں آس اور یاس کے بیچ معلق تھا۔ جاں حلق میں انکی ہوئی تھی۔ رفیق صاحب جلدی سے آئیں۔ کسی طرح اس تذبذب سے تونجات ملے۔

نعمت خان جانے کس وقت کمرے میں داخل ہوا تھا۔ میں نے جب نظر اٹھائی تو وہ خاموش کھڑا مجھے تک رہا تھا۔ میں نے اسے مطمئن کرنے کے لئے کہا کہ ”رفیق صاحب آ رہے ہیں۔ جلدی پہنچنے والے ہیں۔ چائے بناؤ۔“

”اچھا جی۔ کہتے کیا ہیں۔“

”آ تو رہے ہیں۔ چائے بناؤ۔“

نعمت خان مطمئن تو کیا ہوتا۔ اب شاید زیادہ ہی پریشان سا ہو گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مزید کوئی سوال کرے یا چلا جائے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر پھر کہتے کہتے رک گیا اور باہر چلا گیا۔

رفیق صاحب نے آنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔ مگر میں ان کے آتے آتے آس اور پاس کے دوراہے سے گزر لیا تھا اور اپنے سارے اضطراب سے فارغ ہو لیا تھا سو جب وہ آئے تو مجھے یہ جاننے کی کوئی پریشانی نہیں تھی کہ وہ کیا کہیں گے۔

”رات تو اتنی افراتفری تھی رفیق صاحب بیٹھتے ہوئے کہنے لگے ”کہ کچھ پتہ ہی نہیں چل رہا تھا کہ کس کے ساتھ کیا گزری اور کون کہاں ہے کس عالم میں ہے اموات تو ہوئی ہیں مگر زخمی زیادہ ہوئے ہیں تو بہر حال توقع تو یہی ہے۔ ہسپتال کے اندر باہر عزیزوں رشتہ داروں کا بہت ہجوم تھا۔ مگر کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا۔ اتنی جلدی کیسے پتہ چل سکتا تھا۔ ہسپتال کا عملہ بھی اپنی جگہ سچا تھا۔ رفیق صاحب کا لہجہ چغلی کھا رہا تھا کہ وہ دلجوئی زیادہ کر رہے ہیں۔ حقیقت حال کم بیان کر رہے ہیں۔ وہ بول رہے تھے اور میں خاموش ان کا منہ تک رہا تھا۔ میرے پاس کرنے کے لئے کوئی سوال نہیں تھا۔ ظاہر کرنے کے لئے کوئی اضطراب بھی نہیں تھا۔ رفیق صاحب نے بولتے بولتے مجھے دیکھا پھر وہ بھی چپ ہو گئے۔“

نعمت خان چائے لے کر آ گیا۔ اس نے خود ہی چائے بنائی۔ چائے بنا کر ایک ایک پیالی ہم دونوں کے سامنے سرکا دی۔ پھر سر



جھکا کر خاموشی سے باہر نکل گیا۔ چائے واقعی بہت گرم تھی۔ دونوں پیالیوں سے ہلکی ہلکی بھاپ اٹھ رہی تھی۔ پھر بھاپ بیٹھ گئی۔ چائے ٹھنڈی ہوتی چلی گئی۔ ہم اسی طرح گرم مسم بیٹھے رہے نہ کوئی بات کی نہ پیالی کو ہاتھ لگایا۔

چائے ٹھنڈی ہوتے ہوتے بالکل ہی ٹھنڈی ہو گئی۔ سمجھئے کہ برف ہو گئی۔ ہم اسی طرح گرم بیٹھے تھے اتنے گرم کہ جنبش تک نہیں کی۔ بس جیسے ساکت ہو گئے ہیں۔ دو خاموشی کے تو دے بیچ میں ٹھنڈی چائے سے لبریز دو پیالیاں۔

کتنی دیر کے بعد رفیق صاحب نے جنبش کی۔ اٹھ کھڑے ہوئے اچھا میں چلتا ہوں۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔ تکلیف تو اب نہیں ہے۔

”نہیں۔“

”ہاں ٹھیک ہے۔ مگر زیادہ ملیں جھلیں نہیں۔ زخم مندمل ہونے میں وقت لے گا۔ بس آرام کریں۔“ پھر چلتے چلتے سمجھکے ہوئے کہا۔ ”ویسے ابھی میں مایوس نہیں ہوں۔ پھر ادھر ہی جا رہا ہوں۔ کیا خبر ہے کہ..... میں چپ رہا۔

رفیق صاحب کمرے سے نکل رہے تھے کہ نعمت خان آہستہ سے قریب آیا اور مرے ہوئے لہجہ میں بولا ”رفیق صاحب جی اب کیا ہوگا۔“

”نعمت خان تمہیں تو اللہ پر بہت بھروسہ ہے۔“

”ہاں جی، اور کس پر بھروسہ کریں۔“

”تو بس اس پر بھروسہ رکھو۔ میں پھر ادھر ہی جا رہا ہوں۔“

رفیق صاحب چلے گئے۔ ان کے ساتھ ہی نعمت خان بھی کمرے سے نکل گیا۔ دروازے تک انہیں چھوڑنے گیا ہوگا۔ مگر پھر واپس میری طرف نہیں آیا گھر ہی میں ہوگا مگر ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ بھی جا چکا ہے۔ اب میں اکیلا تھا بالکل اکیلا جیسے رات پڑ گئی ہو اور میں اکیلا جنگل میں چلتا۔ چلنا کیا معنی میں تو جما بیٹھا تھا۔ جہاں بیٹھا تھا بس وہیں جما کا جمارہ گیا تھا۔ لگتا تھا کہ اب میں یہاں سے ہل نہیں سکتا جگہ نے جہاں میں بیٹھا ہوں مجھے باندھ لیا ہے۔ میں بندھا بیٹھا رہا۔ پتہ نہیں کتنی دیر تک وقت کا احساس باقی رہا ہوتا تو اندازہ ہوتا کہ کتنی دیر تک میں یوں دم بخود بیٹھا رہا۔

کتنی دیر بعد میں نے پھر یری لی۔ پتھر بنے کب تک بیٹھے رہو گے۔ دل ہی دل میں اپنے آپ کو کتنی ملامت کی۔ ایک دوست ڈھونڈنے کے لئے نکلا ہوا ہے۔ واقعی کیا خبر ہے کہ زندگی بہت ارزاں ہو گئی ہے مگر سخت جان بھی ہے اور پھر زندگی میں معجزے بھی تو

ہوتے ہیں تو میں نے کیوں اتنی جلدی فرض کر لیا اور صبر کر لیا۔ مجھے بھی ڈھونڈنے کے لئے نکلنا چاہئے ایک پھریری سی آئی کہ برقی رو کی مثال پورے جسم میں دوڑ گئی۔ میں یکدم اٹھ کھڑا ہوا۔

دبلیز سے قدم نکالتے نکالتے میں ٹھٹھکا یہ کون سا شہر ہے۔ وہی شہر تو پھر میں وہی نہیں ہوں۔ اس جانے بوجھے شہر میں اچانک میں اجنبی بن گیا تھا۔ میں ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا تھا۔ سامنے جنگل پھیلا ہوا تھا اور رات پڑ چکی تھی۔ پھر؟ کب تک یوں ڈانواں ڈول کھڑا رہوں گا۔ ہمہی باندھی۔ اپنے تذبذب پہ قابو پایا۔ ان قدموں نے اس شہر کے کوچوں کی بہت خاک چھانی ہے۔ خود ہی راستہ تلاش کر لیں گے۔

کتنی دیر تک چلتا رہا۔ میں نہیں قدم خود ہی راستہ تلاش کرتے رہے بڑھتے رہے مسجدیں حمام درخت شہوت کے زیتون کے کھجور کے ان رستوں کو تو میں پہچانتا ہوں۔ یہ حمام الجوزہ ہے اور یہ رابطہ التوت ہے۔ یہ زناقتہ الوری آ گیا۔ اس راہ پر گیا تو مدینہ الحمرہ میں جا کر نکلوں گا۔ یہاں سے میں القیصر یہ کی طرف مڑ گیا۔ رحبات المسجد الاعظم، مسجد الاعظم اتنی خاموش۔ نمازی کہاں گئے؟ جامع التابعین کی طرف سے گزرا تو اسے بھی خاموش پایا۔ باب النبو سے گزر کر مسجد القطانین کی طرف ہولیا۔ عبد اللہ کے تندور کے پاس سے گزرا تو حیران رہ گیا تندور ٹھنڈا پڑا تھا اور عبد اللہ۔ وہ کہاں گیا۔ حیران و پریشان باب الزیاد کی راہ پہ پڑ لیا۔ چلتے چلتے اچانک ٹھٹھک گیا۔ یہ کون سے کوچے میں نکل آیا ہوں یہ تو باب الرملہ ہے مگر باب الرملہ اور اتنا خاموش۔ دونوں وقت مل رہے تھے مل کر جدا ہو رہے تھے پھر چراغ کیوں روشن نہیں ہوئے۔ آگ بجھ چکی تھی۔ خلقت کہ یہاں اڈی ہوئی تھی، تتر بتر ہو چکی تھی۔ باب الرملہ بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ راکھ بہت اڑ رہی تھی۔ بیچ بیچ میں کوئی ادھ جلاورق کسی دیوان کا، کسی صحیفہ کا، کسی فیلسوف کے مخطوطے کا، کسی صوفی کے ملفوظات کا، باقی سکوت تھا۔ صرف ایک بلی بیچ راہ میں بیٹھی اپنی کچے ایسی آنکھوں سے مجھے گھور رہی تھی۔

